اردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:2، شمارہ:2 (جولائی تا دسمبر 2024ء)
ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

ثمن عباس
پی ایچ ڈی اُردو اسکالر، منہاج یونیورسٹی، لاہور

سقوطِ ڈھاکہ اور اُردو ناول

Saman Abbas
Ph.D Urdu Scholar, Minhaj University, Lahore

Fall of Dhaka and Urdu Novel

ABSTRACT
The 1971 tragedy is a significant and painful chapter in Pakistan's history, marked by the involvement of global powers with ulterior motives. Wars devastate not only the physical landscape but also the human psyche, leaving individuals helpless and scarred. Literature serves as a crucial medium to articulate these impacts, capturing the internal and external dimensions of war. Among literary forms, the novel stands out for its role in documenting the fall of Dhaka. These novels vividly portray the historical, political, and cultural complexities of the era, offering narratives of disaster, displacement, and human suffering. Through these works, the profound tragedies of war are preserved and explored in their full depth and nuance.

Keywords: *History, Tragedy, Fall of Dhaka, East Pakistan, conspiracy, Novel, Zara Nam ho to Yeh Mitti, Akhir e Shab kay Hamsafar, Chalta Musafir, Commando, Watan KI Mitti Gawah Rehna, Allah Maigh Day, Do gaz Zameen, Sadiyun ki Zanjeer, Farar, Khaleej*

ڈھاکہ کا لفظ سنتے ہی تصورات کے پردے پر قائداعظم، مسلم لیگ، مولوی اے کے فضل الحق، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، عبدالحمید خان بھاشانی، حسین شہید سہروردی ، تحریک آزادی اور قرار داد جیسے الفاظ ابھر کر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی نمائندہ، واحد سیاسی جماعت مسلم لیگ کا قیام بھی 1906ء کو ڈھاکے میں عمل میں آیا۔ تحریک آزادی اور پاکستان کے حصول کی کامیابی میں بنگالی عوام کا جوش و جذبہ شامل تھا۔ پاکستان کے حصول کے لیے بنگالیوں نے قائداعظم کے ساتھ مل کر کڑی محنت کی اور اس کے لیے اپنی جان دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ایک مذہب اور ایک نعرے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا وطن دو حصوں بنگلہ دیش اور اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تقسیم ہو گیا۔ محترم ڈاکٹر ضیاالحسن اس المیے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

Article (2-2-6) Published on 31-12-2024, Pages (57-72)
Email: tashkeel@uoj.edu.pk , Website (OJS): tashkeel.uoj.edu.pk
Department of Urdu, University of Jhang, Chiniot Road, Jhang, Punjab, Pakistan.

"سولہ دسمبر پاکستان کی تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا۔ ماضی کے اوراق پلٹیں تو اس سارے عمل میں دشمنوں کے گھناؤنے چہرے عیاں ہوتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ یہ المناک واقعہ جہاں ایک طرف ہمارے لیے ناقابل فراموش ہے وہاں دوسری طرف تلخ حقائق کو بھی چھپائے ہوئے ہے۔"(1)

پاکستان اور بھارت کے قیام کو تقسیم ہند کہا جاتا ہے جس کے مطابق دونوں ممالک نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ تقسیم کے بعد پاکستان کو اسلامی دنیا کی سب سے بڑی مملکت ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سابقہ مشرقی پاکستان تک کا زمینی راستہ بھارت سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے قائداعظم نے بھارت سے زمینی راستے کا مطالبہ کیا جسے رد کر دیا گیا۔ 1947ء میں پاکستان آزاد ہوا تو چند مہینوں میں ہی مخالفین کی کارستانی عروج پر جا پہنچی اور بنگالی عوام کے دلوں میں نفرت کا بیج بونے کی سازشیں شروع کر دی گئیں۔ جعفری 7 مارچ 1948ء کو قائدِاعظم کے ڈھاکے میں خطاب کے الفاظ کو یوں بیان کرتے ہیں :

"پاکستان کے بدخواہوں نے پاکستانی مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے بنگالی اور غیر بنگالی کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس طرح صوبائی عصبیت نے جنم لیا ہے جو پاکستان کی سالمیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جب تک اس عصبیت کو نکال نہ پھینکا جائے آپ صحیح معنوں میں ایک قوم نہیں بن سکتے۔"(2)

فروری 1948ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے اُردو کو قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کا فیصلہ کیا لیکن بنگالی اردو زبان کے نفاذ کو اپنی سالمیت کے لیے خوش آئند نہیں سمجھتے تھے، لہذا زبان کو باقاعدہ مسئلہ بنا کر بنگال میں تحریکوں کا آغاز ہوا۔ 1956ء کے آئین کے مطابق بنگلہ زبان کو دوسری قومی زبان ہونے کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سیاسی لیڈروں نے عُسری معیشت کا مسئلہ اٹھایا۔ مسائل جوں کے توں رہے۔ صدر اسکندر مرزا کے مارشل لا کے بعد آئین کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ پارلیمانی نظام کی بجائے ملک میں صدارتی نظام قائم ہو گا تو مشرقی پاکستان میں اس بات پر شدید ردعمل ہوا۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں نے دو اقتصادی نظریے کی بات شروع کر دی۔ صدر پاکستان نے بنگلہ دیش کے مسائل کو حل کرنے کی سعی کی۔ مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔ بعد ازاں 1965ء کی جنگ چھڑ گئی۔ دس کروڑ مسلمانوں کے اتحاد اور تنظیم سے پاکستان کو فتح نصیب ہوئی لیکن جنگ بندی کے بعد معاہدہ تاشقند سے دشمن مایوس ہو گیا۔ 1966ء میں مجیب الرحمن نے چھ نکات پیش کیے۔ بعد ازاں ان نکات میں مغربی پاکستان کی طرف سے ترامیم کر کے دوبارہ پیش کیا گیا۔ 1969ء میں دوسرا مارشل لا لگایا گیا اور اقتدار جنرل ایوب خان سے جنرل یحیٰ خان کو منتقل کر دیا گیا۔

مغربی پاکستان میں بھی اقتدار اور طاقت کو ہتھیانے کے لیے مفاد پرست کوششوں میں مصروف تھے۔ مشرقی پاکستان زبردست سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ مغربی پاکستان کی طرف سے امدادی سامان فراہم کیا گیا۔ 7 دسمبر اور 17 دسمبر کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کروائے گئے۔ انتخابات میں مجیب الرحمن اور بھٹو کو برتری حاصل ہوئی۔ برتری کے باوجود عوامی پارٹی بے اختیار رہی۔ اس سے عوام میں مزید بے چینی پھیل گئی۔ بنگالیوں کے مطابق مغربی پاکستانی ہمیں محکوم اور خود کو فاتح حکمران تصور کرتے ہیں۔ صدر یحیٰ خان کی ڈھاکہ آمد پر زور دیا گیا اور ۳ مارچ کو اسمبلی کے اجلاس کے لیے انتظامات کیے گئے لیکن اجلاس نہیں ہو سکا۔ ۲۳ مارچ کا دن مشرقی پاکستان میں یوم مزاحمت کے طور پر منایا گیا اور بنگال کا پرچم بھی لہرا دیا گیا۔ سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی اور عوامی سطح پر جھڑپیں شروع ہوئیں۔ حالات بدترین ہو گئے۔ 25 مارچ 1971ء کو آپریشن کا آغاز ہوا۔ اس آپریشن کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا اور حالات کے پیشِ نظر جنرل نیازی نے فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ 16 دسمبر 1971ء کو دنیا کے نقشے پر پاکستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ اقتدار کی ہوس اور علاقائی تعصب اس واقعے کی بنیاد نظر آتے ہیں۔

اس سانحے کے ضمن میں چوبیس سے زائد اردو ناول لکھے گئے ہیں جن میں حقیقت سے پردہ اٹھانے کی سعی کی گئی ہے۔ اس مقالے میں چند منتخب ناولوں میں "سقوطِ ڈھاکہ" کے المیے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

بنت الاسلام کا تعلق اسلامی ادبی تحریک سے تھا۔ ناول "ذرا نم ہو تو یہ مٹی " 1978ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول ادارہ بتول لاہور سے شائع ہوا۔ مصنفہ کا اصل نام رفعت اقبال لیکن اپنے قلمی نام سے مشہور ہوئیں۔ ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ ناول 1971ء کی جنگ کے مغربی پاکستانیوں پر اثرات کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ ناول کا مکانی دائرہ کار مغربی پاکستان لاہور کا علاقہ ہے۔ خواتین کالج لاہور کے حالات و واقعات اور کالج کی سیاست کے عروج و زوال پر مبنی ہے۔ بیشتر ناولوں میں مشرقی پاکستان کی سیاست اور حالات و واقعات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مصنفہ نے اس وقت کے حالات اور لوگوں کے احساسات کی ترجمانی کے لیے قلم اٹھایا۔ مغربی پاکستان کی خواتین کرداروں کے ذریعے حالات کا نقشہ کھینچا۔

ناول کی ابتداء کالج کے ایک سیاحتی تفریحی دورے سے ہوتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار لیکچرار مس منزہ اصغر ہیں۔ اس کے علاوہ پرنسپل ڈاکٹر تہمینہ اقبال، وارڈن مسز منصور، لیکچرار مس بلقیس کے کردار بھی شامل ہیں۔ دونوں اطراف کے محبِ وطن لوگوں کے جذبات کی ترجمانی عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔

ناول میں دکھایا گیا ہے کہ مسز بلقیس ایک محبِ وطن کردار ہے۔ وہ جب بھی ملکی سالمیت پر خطرے کے متعلق سنتی تو بے چین ہو جاتی۔ سیاحتی دورے کے دوران میں راستے میں جتنی بھی قومی املاک پر ان کی نظر پڑتی وہ ان پر آیت الکرسی کا دم کر کے پھونک دیتی۔ جب بھی ملک کے متعلق کسی ناخوشگوار واقعے کا سنتی تو سر بسجود ہو جاتی اور دعا

کرتی کہ "اے میرے خدا میرے ملک اور اس کے اثاثہ جات کی حفاظت فرما"۔ ملکی حالات خراب ہونے کے باعث جب کالج بند کر دیے جاتے ہیں تو دور دراز سے تعلق رکھنے والی طالبات ہاسٹل میں سارا دن کپڑے سلائی کا کام کرتیں اور دیگر اشیائے خورونوش کو ڈبوں میں محفوظ کر لیتیں۔ مناسب وقت پر سارے سامان کو مہاجرین کے کیمپ تک پہنچا تیں۔ ڈاکٹر تہمینہ اقبال اس سے پہلے مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان تک بھی اپنی خدمات بہم پہنچاتی تھی۔ اس سانحاتی دور میں بنت الاسلام نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کے جذبات و احساسات اور سوچ کے فرق کو طالبات کے مابین مکالموں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ ثمر اپنی روم میٹ شمس النہار کو سمجھاتی ہے کہ ہم نے یہ ملک بہت سی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے، اب ہمیں متحد ہونے کی ضرورت ہے؛ مگر اس کی مغربی پاکستان کے لیے نفرت کم نہیں ہوتی۔ ثمر کی والدہ کی زبانی پاکستان بننے کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے:

> "وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ستائیسویں کی رات تھی۔ یادگار رات، اس رات پاکستان بنا تھا۔ مدتوں سے ہم آزمائشوں کی بھٹی سے گزر رہے تھے۔ قتل، خون، گولیاں آگ، فریاد و فغاں، غلامی کا جن نکلنے سے پہلے ہمارے پورے ڈھانچے کو ہلا رہا تھا مگر وہ رات شیریں آئی تھی۔ جب بارہ بجے تو ایک دم فضا بدل گئی۔ جب ریڈیو نے پہلی بار کہا "یہ ریڈیو پاکستان ہے" تو ہم خوشی کے مارے زور زور سے چیخنے لگے۔ ہم پاگل ہو گئے۔ مسرت نے ہمیں دیوانہ کر دیا۔"(3)

کالج کا ہر کردار خواہ وہ کسی بھی ماحول اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے، مختلف نظریات کا حامل ہے، اپنی ایک الگ سوچ اور خاص نظریات و تصورات کو قائم رکھے ہوئے ہے اور یوں ایک معاشرے یا ایک ملک میں قیام پذیر عوام کی ذہنی سطح کی عکاسی کرتا ہے۔ مذہب اور مذہبی تعلیمات کو اولیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس ناول میں ایک درد مند مسلمان کا رنج و غم بھی دکھائی دیتا ہے اور آنے والے دور میں حالات کی بہتری کی آرزومندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

قراۃ العین حیدر کا ناول "آخر شب کے ہمسفر" 1984ء میں منظر عام پر آیا۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوا۔ ۳۵۰ صفحات پر مشتمل یہ ناول ۴۶ عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر 1926ء میں پیدا ہوئی۔ آپ نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہوئیں لیکن کچھ عرصہ قیام کے بعد بھارت واپس چلی گئیں۔ صحافت کے شعبے سے وابستہ رہیں۔ لیکن ان کی بنیادی پہچان اردو ادب کی خاتون ناول نگار کی حیثیت سے ہے۔ اس ناول کی وجہ سے انھیں ادبی اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ناول کا آغاز ڈھاکہ شہر کے علاقے سے ہوتا ہے۔ اس کے مرکزی کردار دیپالی، ریحان، اومارائے، روزی، ڈاکٹر سرکار، بنوئے چند وغیرہ ہیں جو انقلاب کی باتیں کرتے کرتے رفتہ رفتہ اسی ماحول کا حصہ بن جاتے ہیں جس کے خلاف وہ بولتے ہیں۔ یہ ناول بنگال کی

انقلابی اور سیاسی سرگرمیوں کی مکمل تاریخ لیے ہوئے ہے اور قیام بنگلہ دیش کا مطالبہ ہی اس کا موضوع ہے۔ اس میں موجود اکثر کرداروں کی گفتگو اشتراکیت اور انقلاب کے ارد گرد ہی گردش کرتی ہے۔ مصنفہ نے اپنے کرداروں کے ذریعے انقلابی آدرشوں کے حامل افراد کے چہروں کو بے نقاب کیا ہے۔ کہیں کہیں علامتی، اشارتی اور طنزیہ اسلوب کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ ناول میں بیان کرتی ہے:

> "ان عمارتوں کے روشن کمروں کی دیواروں پر لگی برطانیہ کے شاہی خاندان اور بنگال کے سابق گورنروں کی آنکھیں چپ چاپ سامنے کے منظر کو دیکھ رہی ہیں جہاں بھانت بھانت کے سماجی اور اقتصادی پس منظر سے آتی ہوئی قدیم بنگال کی بیٹیاں اپنی اپنی کتابوں پر جھکیں حصول علم میں منہمک تھیں اور کون کہہ سکتا تھا کہ باہر بیکراں فضاء پرانی جنگوں کے جھنکار سے گونج رہی ہے۔ ان جنگوں میں لڑنے والے جو زبانیں بولتے تھے، وہ بولی گئیں اور وہ قومیں اور وہ نسلیں ختم ہو گئیں جن وجوہات پر اور جن مقاصد کے لیے وہ لڑائیاں لڑی گئیں۔"(4)

اس ناول کا کردار اپنے آدرش کو دولت اور کرسی کے لیے قربان کر دیتا ہے۔ دیپالی سرکار انتہائی سوچ و بچار کے بعد ریحان الدین کی تحریک کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے وہ گھر کا سارا سامان لٹا دیتی ہے اور گھر میں چوریاں کرتی ہے۔ چوری چھپے قیمتی سامان تحریک کو دے دیتی ہے اور ہر ایجنڈے میں ریحان الدین کے خیالات کا پرچار کرتی ہے۔ دونوں کا قصہ بہت ہی دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ ان کی زندگی میں سیاست، محبت، انقلاب اور عشق کے دھارے بڑے حسین انداز میں ملے ہوئے ہیں۔

الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" 1980ء میں جمہوری پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ 254 صفحات پر مبنی یہ ناول تین فصلوں میں لکھا گیا ہے۔ الطاف فاطمہ 1927ء لکھنو انڈیا میں پیدا ہوئی اور تقسیم ہند کے بعد لاہور منتقل ہو گئی۔ پنجاب یونی ورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پیشے کے لحاظ سے معلمہ تھیں لیکن ادب میں ناول نگاری، افسانہ نگاری اور ترجمہ نگاری میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔ تنقید ی اصناف پر بھی طبع آزمائی کی۔ الطاف فاطمہ نے سانحہِ مشرقی پاکستان کے ضمن میں بہاریوں کے مسائل اور استحصال کو اجاگر کیا۔ پہلی فصل میں 1947ء کے بعد کے مناظر اور دوسری فصل میں 1971ء کا دلخراش سانحہ بیان کیا ہے۔ تیسری فصل میں بنگال سے پاکستان منتقل ہونے کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔

اس ناول کے مرکزی کردار سید صاحب، مزمل اور ان کا بیٹا مدثر ہے۔ ثانوی کرداروں میں سرکار بیگم، دلہن بیگم، نعیم، منظور السلام، غضنفر، ریٹا، بدرالدین، سلمان، بذل دا، سلسبیل، نصیبا (نصیر و کی بیوہ) وغیرہ شامل ہیں۔

ناول کا آغاز عیدِ قربان کے تہوار سے ہوتا ہے اور قربان گاہ میں جو ان نمازیوں کا خون بہادیا جاتا ہے۔ناول کا مکانی دائرہ کار پٹنہ اور لکھنو کا علاقہ ہے۔ہندوستان میں مقیم زمین دار "سید صاحب" جو تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن ہیں، ان کے خاندان کی کہانی ہے جو غیر متصل اور بے یارومددگار اپنی روحانی اور مادی تکالیف میں مبتلا ہے۔ایک ہی خاندان دو بار ہجرت کے درد سے گزرتا ہے۔ناول میں سقوطِ ڈھاکہ کے محرکات کی نشان دہی کی گئی ہے۔بذلل دا اور فضل الرحمان جیسے بنگالی کردار احساس، محبت اور امن پسندی کا استعارہ ہیں۔شر پسندوں کی طرف سے پھیلائے گئے لسانی اور مذہبی تفرقات کے باوجود بنگالی اور پاکستانی ایک دوسرے کا سہارا بنے رہے۔جب مدثر کو پاکستان روانہ کیا جاتا ہے تو وہ دل میں اس طرح سوچتا ہے:

"آج میرا باپ اور میں دوسری مرتبہ اپنا گھر بار چھوڑ رہے ہیں۔کیا تمام دنیا میں ایسے
انقلابات آتے ہیں کہ لوگ آئے دن بے گھر ہوتے ہیں یا صرف یہ ہمارا مقدر ہے"(5)

پنجابی کرنل کی بیٹی سلسبیل اور فضل الرحمان کا عشق ادھورا رہ جاتا ہے۔سلسبیل کی شادی سلمان سے ہو جاتی ہے اور وہ ایبٹ آباد منتقل ہو جاتے ہیں۔تایا جان سلسبیل کو پہیلی سناتے ہیں جسے سن کر وہ اکثر بے چین ہو جاتی :

"اتنی سی ڈبیا ڈب ڈب کرے
چلتا مسافر گر گر پڑے" (6)

بہاریوں کے المیے کے ساتھ مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی بے حسی کی جھلک بھی پیش کی گئی ہے۔وہ ڈھائی لاکھ بہاری جو منتظر تھے، ملکِ پاکستان کی خاطر وہ برباد ہو چکے تھے، شاید انھیں کوئی وہاں بلالے لیکن دہائیاں گزر گئیں کوئی ان کا منتظر نہیں تھا ؛سب اپنا ٹھکانہ ملنے پر بے فکر پڑے رہے۔بہاریوں نے پاکستان کی آزادی کے لیے بہت سی قربانیاں پیش کیں اور علیحدگی کی تحریک میں پاکستان کی سالمیت کی حمایت کی تھی لیکن جب معاملات سیاسی تناظر میں تبدیل ہو جاتے ہیں تو مثبت قدریں بھی خوف اور تعصب کا شکار ہو جاتی ہیں۔

"کمانڈو" طارق اسماعیل ساگر کا لکھا ہوا تاریخی اور جاسوسی ناول ہے۔ساگر 1952ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔یہ ناول 1984ء میں منظر عام پر آیا۔ ۲۶۲ صفحات پر مشتمل یہ ناول قومی کتب خانہ لاہور سے شائع ہوا۔ 14 ستمبر 2021ء کو بوجہ کرونا لاہور میں وفات پائی ۔وہ ایک محب وطن ناول نگار تھے جن کی زیادہ تر تحریریں جنگوں کے حالات و واقعات پر مبنی ہیں۔ پیش لفظ میں ان کی تحریر کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"جب میں بھارت میں قیدی تھا۔۔۔۔دوران تفتیش بھارتی انٹیلی جینس کے ایک ایس پی
نے کہا تھا" تم پاکستان اس جنم میں چلے جاؤ! لیکن ۔۔۔۔تمھارا جسم تمھیں کئی جنم تک یہ
یاد دلاتا رہے گا کہ۔۔۔۔تم نے بھارتی تفتیش کاٹی ہے" ظالم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"(7)

ناول "کمانڈو" کے آٹھویں صفحے پر اقبال کی نظم ساقی نامہ موجود ہے۔ ناول کُل ۱۴ عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے۔ پاکستانی فوج کی طرف سے کیے جانے والے ایک خفیہ مشن کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے۔ فوجیوں کے لیے تو ہر مشن موت کا مشن ہوتا ہے۔ جہاں جنگیں چھڑ جاتی ہیں وہاں معصوم نہتے لوگوں کی جانوں کا سودا بھی کیا جاتا ہے۔ ناول میں بنگالی بغاوت اور فوجی آپریشن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مرکزی کردار لفٹیننٹ علی کی جرات اور جانبازی کا عملی مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار لفٹیننٹ علی اس کے علاوہ آنسہ، اس کا بھائی عثمان اور اس کے والد کے کردار نمایاں ہیں۔ ثانوی کرداروں میں امیت سرکار (مقامی غنڈا)، صاعقہ، حامد، شرما(بھارتی خفیہ ایجنسی را)، لفٹیننٹ فاروق وغیرہ شامل ہیں ۔ ناول کا آغاز کراچی سے ڈھاکہ کے ہوائی سفر سے ہوتا ہے۔ منظر نگاری جاندار ہے۔ ناول کا مکانی دائرہ کار ڈھاکہ اور محمد پور کا علاقہ ہے ۔ مسلمان مغلوں کی حکومت کی طرح غفلت کا شکار ہو گئے تو دشمن نے موقع غنیمت جانا۔ اس نے رفتہ رفتہ نفرت کے بیج بونا شروع کر دیے اور اب وہ نفرت کی فصل کٹنے کو تیار تھی۔ یہ ناول ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جب بنگالی مکمل طور پر مغربی پاکستان کے خلاف ہو چکے تھے۔

انتخابات کے بعد ملک کی سیاسی اور سماجی فضاء کا نقشہ تبدیل ہو گیا ۔ فوج کی عظیم قربانیوں کی مثال کردار "منیر" کی شکل میں موجود ہے جو چند دن پہلے اپنی نئی نویلی دلہن سے وعدہ لے کر مشرقی پاکستان آتا ہے اور اپنی شہادت کے وقت صغرا ں کے لیے درد بھرا پیغام چھوڑ جاتا ہے۔ ہر جانباز شہید کی طرح وہ کہتا ہے سر میری ماں سے اور گھر والوں سے کہیئے گا کہ "میں نے جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی "۔ منیر کا باپ چاچا منظور مشرقی پاکستان اسے ملنے آتا ہے اور اس کی شہادت کی خبر سن کر کہتا ہے کہ "شہیدوں کے باپ رویا نہیں کرتے۔"

ناول میں محب وطن بنگالیوں کی خدمات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپریشن کے دوران کوئی بنگالی ہماری مدد کرتا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا لیکن اس کے باوجود بہت سے بنگالیوں نے دشمنوں کے اڈوں تک پہنچنے میں ہماری مدد کی۔ مکتی باہنی کے ظلم و جبر کی بہاریوں پر ظلم کی داستان کو اس طرح رقم کرتے ہیں :

> "ساری رات خونخوار بھیڑیے اس بے کس اور بدبخت بوڑھے بہاری پر جس کا جرم یہی تھا کہ وہ اپنی مٹی سے محبت کرنے والا ہے۔ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے رہے اور صبح اس کی مسخ شدہ لاش محلے کے باہر پھینک گئے۔ چاچا کا چہرہ اذیتیں دے دے کر اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ چند لمحوں کے لیے بھی اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو گڑھے نظر آ رہے تھے۔ ہونٹ اور کان کٹے ہوئے تھے"۔ (8)

ناول میں مکتی باہنی افراد کے بہاریوں پر ظلم وستم اور انتقام کی تفصیل کے ساتھ ساتھ آنسہ اور علی کی محبت کا رومانی عنصر بھی موجود ہے۔ آنسہ بھی بھارتی گدھوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور دار فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔ ساگر اس دردناک منظر کو یوں بیان کرتے ہیں :

"آنسہ بنگال کی بیٹی تھی۔ اس کے خاندان نے اس مٹی کی تقدیس کے لیے اپنی جانیں نذر کی تھیں۔ وہاں کے لوگوں نے تو انھیں دھتکار دیا لیکن مٹی کی غیرت نے یہ گوارانہ کیا کہ اس کی بیٹی کو کہیں اور پناہ ملے۔۔۔۔۔۔ میرے پنجاب کی ہریالیاں بانہیں پھیلائے اسے پکارتی رہیں مگر میرے بنگال کی بیٹی اپنی مٹی میں سما گئی۔"(9)

ناول واضح، سادہ اور آسان پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ قاری کو واقعات کی گتھی سلجھانے میں تردد نہیں کرنا پڑتا۔

طارق اسماعیل ساگر نے 1986ء میں اس سلسلے سے جڑا ایک اور ناول "وطن کی مٹی گواہ رہنا" لکھا۔ ناول میں پاکستانی جاسوسوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسے جاسوس جنہیں پاکستان کی سرزمین سے ٹریننگ دے کر بھارت بھجوایا جاتا ہے اور وہاں کے حالات اور دشمن ملک کی سازشوں سے عوام کی حفاظت کے پیشِ نظر فوج کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار عابد خان ہے۔ ثانوی کرداروں میں رما، نتھا سنگھ، جیتو، مسز سہائے رجنی، میجر کبیر، کشور اور بلاقی رائے وغیرہ شامل ہیں۔ عابد خان کو ایک باقاعدہ ٹریننگ کی زیر نگرانی رکھا جاتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد اسے مشن پر روانہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ ایک سمگلر بن کر ہندوستان جاتا ہے جس کا نام اومکار پوری ہے۔ نتھا سنگھ گائیڈ کی حیثیت سے عابد خان کے ساتھ جاتا ہے اور بارڈر پار کرتے ہوئے غداری کا مرتکب ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ سکے کا دوسرا پہلو یہ کہ نتھا سنگھ مجبوراً بھارتیوں سے معاہدہ کر لیتا ہے۔ بنگلہ دیش، مکتی باہنی کے افراد اور شیخ مجیب الرحمٰن کی تحریکوں کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے مکتی باہنی کی تفصیل میں ناول کا ایک اقتباس ہے:

"ارے یہ لوگ باقاعدہ فوجی نہیں ہیں" بلاقی رام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو کون ہیں یہ"
خان کی بجائے سہائے نے پوچھا۔
تم تو اپنے لوگ ہو کسی کو بتانا نہیں۔ یہ راز کی باتیں ہوتی ہیں۔ بلاقی رام نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا" یہ مکتی باہنی ہے۔"
مکتی باہنی کیا؟
خان نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھ لیا

۔۔۔۔۔۔ادھر ڈھاکہ سے جو لوگ بھاگ کر آتے ہیں ہم انھیں ٹریننگ دے کر پوربو
پاکستان بھیج رہے ہیں" بلاقی رام نے سمجھایا۔"(10)

بلاقی رام نے پوری تفصیل بتائی کہ ان تمام میں کچھ لوگ بنگالی ہیں اور کچھ کلکتہ سے ہیں، وہ پوربی پاکستان میں معصوم بنگالی بننے کی اداکاری کرتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کو اپنی خستہ حالی اور غربت کی دہائی دے کر عوام کو حکومت کے خلاف کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ناول کا اقتباس :

"جب وہ چشم تصور سے اپنے مشرقی پاکستان کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تو اس کی نسیں ٹوٹنے لگتیں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا۔ بس امید تھی کہ جو کبھی کبھی اس گھور اندھیرے میں اس کے لیے شمع بن کر اجالا پھیلانے لگتی۔ وہ سوچتا: آخر سب ہی بنگالی تو ایسے نہیں؟ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے دل سے ہوک اٹھنے لگتی: " آخر ایسے ہی وہ کتنے لوگ ہیں؟" آٹے میں نمک کے برابر بھی ان کی تعداد نہیں ان کے بھائی ہی انھیں مار ڈالیں گے۔"(11)

طارق محمود کا ناول " اللہ میگھ دے" 1987ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول ۲۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ انتساب کے الفاظ کچھ اس طرح سے ہیں :

"تاریخ کے اس عظیم سبق کے نام
جس سے ہم کچھ نہیں سیکھتے"(12)

پیش لفظ میں مصنف کی لکھی ہوئی خوبصورت نظم شامل ہے۔ ناول کا مکانی دائرہ کار سابقہ مشرقی پاکستان کے ضلع باریسال، کھلنا اور ڈھاکہ کا علاقہ ہے۔ ناول کا آغاز رات کی گہری اور گھنی خاموشی سے ہوتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ''عمر'' جس کا تعلق مغربی پاکستان کے شہر کراچی سے ہے؛ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں پڑھنے کے لیے جاتا ہے۔ ناول کے ثانوی کرداروں میں قیوم، ڈاکٹر محمود، طیب، بیوٹی، سراج الاسلام، حزب اللہ، بدرالاسلام اور فضلو وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف نے یونی ورسٹی کی سیاست اور لسانی تعصب کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔

مخالفین کی اصل سازش بنگالیوں کی صنعت پر قبضہ قائم کرنے کی تھی اس مقصد کے لیے عوام کو یقین دلایا گیا کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو اپنی عیاشیوں کے سبب بھوک اور قحط کی اندھی وادی میں دھکیل دیا ہے۔ مشرقی پاکستان کی مخالف پارٹیوں نے طلبہ کی ذہن سازی کے لیے ایسے ایسے پوسٹر تیار کیے جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے:

"سلیم اللہ ہال کے صدر دروازے پر میں نے ایک اور پوسٹر دیکھا۔ سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے پاشا کا ہاتھ بہت منجھا ہوا تھا۔ ایک گائے دکھائی دی جو گھاس تو مشرقی پاکستان میں کھا رہی تھی! بنگال کا سبزہ اس کے منھ میں تھا۔ دودھ سے بھرے تھن ! تھنوں سے رستا دودھ مغربی پاکستان میں بہہ رہا تھا۔"(13)

بنگالی مزاحمتی رویہ اپنا چکے تھے اور مغربی پاکستانیوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ مصنف طلبا کی تحریک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"لڑکے اور لڑکیوں کا ایک پرجوش ہجوم سامنے میدان میں بوڑھ تلا اکٹھا ہو رہا تھا۔ لائبریری اور ڈھاکہ آرٹ کالج کی سمت سے سفید کُرتے پائجاموں میں ملبوس طلبہ سوت کی سیڑھیاں پہنے۔ لڑکیوں کا ہجوم پلے کارڈ تھامے نعرے لگاتا بوڑھ تلا کی طرف بڑھتا آرہا تھا جوگ دیں۔۔۔۔۔۔ جوگ دیں بوڑھ تلا آیے۔۔۔۔۔۔۔ بوڑھ تلا آیے"(14)

معاشرتی اثرات کا گہرا اور واضح نشان بہاریوں کی قربانیوں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ اساتذہ کے کردار کی وضاحت کے لیے ڈاکٹر ابو طالب محمد ناصر الدین محمود کی سرگرمیاں اور جذباتی پن موجود ہے۔ بنگال کی تہذیب ، کلچر اور ثقافت کا بھرپور اظہار بیوٹی کے کردار سے اجاگر کیا گیا ہے۔ مکتی باہنی گروہ کی سیاسی سرگرمیاں اور مغربی پاکستانیوں کی عزت کو پامال کرنے کے واقعات موجود ہیں۔ یہ ناول ایک اہم سیاسی دستاویز ہے۔

عبدالصمد کا ناول "دو گز زمین" 1988ء میں نصرت پبلشرز لکھنو سے چھاپا گیا۔ ۲۹۰ صفحات پر مشتمل یہ ناول ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا۔ ناول کی تقسیم چار حصوں میں کی گئی ہے اور اس کا انتساب نانی اماں مرحوم کے نام ہے۔ ناول کا مکانی دائرہ کار اسلام پور، پٹنہ، بہار شریف اور گاؤں بین کا علاقہ ہے۔ ناول کا آغاز بہار شریف کے پچھم میں 19 میل کے فاصلے پر موجود گاؤں بین کے خاندان کی کہانی ہے جس کے افراد عزت نفس اور شناخت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار شیخ الطاف حسین ہے اور ثانوی کرداروں میں سرور حسین، اصغر حسین (وکیل) اختر حسین، اس کا بیٹا حامد حسین اور بیٹی خالدہ، فیاض، عالیہ اور نازیہ وغیرہ شامل ہیں۔ شیخ الطاف سے کہانی کا سرا شروع ہوتا ہے۔ الیکشن کی تمام تفصیل جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ تمام لیڈر مسلم لیگ کی اہمیت، تقسیم ہند کی افادیت اور کانگریس کی مسلم دشمنی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی بنیادوں پر گھر تقسیم ہو گئے۔ ہندو مسلم فسادات عروج پر پہنچے۔ گھروں کے گھر اجڑ گئے۔

پہلے تقسیم کے فوری بعد اور پھر 1965ء کی جنگ کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان میں جینا دوبھر ہو گیا تھا۔ لیکن بی بی جی جیسے کردار جن کا اوڑھنا بچھونا ہندوستان کی سرزمین تھی وہ کسی صورت پاکستان جانے کو تیار نہ تھے۔ فضا

میں کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔بی بی جی جیسے کردار کے ذریعے ایک ماں کی نفسیاتی حالت کے اظہار کے لیے ناول کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"پاکستان۔۔۔۔۔ارے او نامراد۔۔۔۔۔،تو میرے بچے کو کھا گیا، میرے خاندان کو برباد کر دیا۔اب میری بچی کو تو نہ کھا۔خدا کے لیے یہاں سے واپس چلا جا۔تجھ پر خدا کی مار ۔۔۔۔۔میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں پاکستان" (15)

تقسیم کے بعد حامد بنگالی لڑکی نازیہ سے شادی کر لیتا۔ایک کیمپ میں موجود حامد جب کچھ لوگوں کے متعلق دریافت کرتا ہے تو اسے یوں بتایا جاتا ہے:

" یہ لوگوں کو لے کر کہاں جاتے ہیں۔۔۔؟
ارے ان لوگوں نے سبھی بہاریوں کو اسی طرح قتل کیا ہے، جانوروں کی طرح رکھا ہے۔
قصابوں کی طرح روز آتے ہیں اور چند چن کر لے جاتے ہیں گولی مارنے" (16)

حامد کو نہ تو بنگال کی سرزمین قبول کرتی ہے اور نہ ہی کراچی کی عوام۔بے روزگاری سے تنگ آ کر وہ بیرون ملک مقیم ہو جاتا ہے اور اپنے والد کو خط میں لکھتا ہے:

"عزت نفس یہاں نہیں ہے ابا۔۔۔۔جس چیز کے لیے ہم لوگ ہندوستان میں مرتے رہے، پاکستان میں ترستے رہے، اس شے کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔یہاں سب کچھ کھو کر جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ پیسہ ہے جس سے ہر چیز بازار میں خریدی جاتی ہے۔" (17)

رضیہ فصیح احمد کا ناول "صدیوں کی زنجیر" 1988ء میں منظر عام پر آیا۔سات سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ناول مکتبہ اسلوب کراچی سے چھاپا گیا ۔ناول میں کئی خاندانوں کو زنجیر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔پہلے باب میں فوج کے تفصیلی کردار کو تحریر کیا گیا ہے۔اس ناول کے بنیادی کرداروں میں قاسم، کیپٹن جواد، زری اور شیزی وغیرہ شامل ہیں۔اس ناول کا جاندار کردار زری ہے جو کہ متنوع رنگ و نسل کے امتیازات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بنگالی نوجوان شمس الرحمن سے شادی کر لیتی ہے۔زری درپیش مسائل کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے:

"میرا قد، میرا رنگ، میرے بال، میری زبان، میرا لباس ہر چیز یہاں کے لوگوں کے لیے قابلِ نفرت ہے۔کسی سے کچھ پوچھوں تو جواب نہیں ملتا، راستہ پوچھ لوں تو گونگے بن جاتے ہیں، نفرت کی یہ چنگاریاں میری روح کو جھلسا دیتی ہے" (18)

یہ ناول سیاسی صورتحال کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس میں پاکستانی فوج کی داستانِ غم اور بے سروسامانی کو بیان کیا گیا ہے۔ متحدہ قومیت کے تصور کو فراموش کر کے انسانوں کے بہیمانہ سلوک کی داستان سنائی گئی ہے۔ مصنفہ ناول میں فوج کو ذمہ دار بھی ٹھہراتی ہیں اور ان کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتی ہیں۔

"تنہا" سلمی اعوان کا لکھا ہوا بہترین ناول ہے۔ ۲۸۷ صفحات پر مشتمل یہ ناول دوست پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ ناول کا آغاز سومی کے کردار سے ہوتا ہے اور پھر کالج کی سیاسی سرگرمیاں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سومی کے علاوہ اجتبیٰ الرحمان ناول کا مرکزی کردار ہے۔ دونوں کرداروں میں نظریاتی اختلاف بھی ہے اور محبت بھی۔ ان کے علاوہ محسن، ظفر، عطا، زہرت چچی، نور العباد اور نیلما کے کردار بھی موجود ہیں۔ سومی کا کردار باطل کے خلاف ڈٹ جانے اور حق سچ کے لیے جان قربان کرنے کے فلسفے کی ترجمانی کرتا ہے۔ سومی ایم اے سیاسیات کرنے کی غرض سے بنگلہ دیش جاتی ہے۔

ناول کے کردار جاندار اور متحرک ہیں ۔ناول کو بنگالیوں کی مغربی پاکستان سے توقعات اور حمایت کی آرزو کا بیانیہ کہا جاسکتا ہے۔ ملک کی زرعی آمدنی کا بیشتر حصہ مغربی عوام کے کھاتے میں ڈالا جانا بنگالیوں کو کسی صورت منظور نہ تھا۔ لسانی تعصب کے سبب مغربی پاکستان سے نفرت کا اظہار بھی ناول کے اہم موضوع ہے جو اس اقتباس سے واضح ہے:

> "میں تو نہیں جانتا کسی کرنل ورنل کو اور تف ہے! پچھمی دیش کی ان الٹرا ماڈرن لڑکیوں پر جنہیں ہمارے مسائل میں گلیمر نظر آتا ہے اور جو اسے اتنی ہی دلچسپی ہے بنگلا کلچر سے تو یہ اپنے ان کولونیل مزاج کے انکلوں سے کیوں نہیں پوچھ لیتی جو یہاں ہم پر حکومت کرنے آتے ہیں۔ وہ ناک بھوں چڑھا چڑھا کر اس کی تفصیلات بتانے میں بلاشبہ فخر محسوس کرتے ہیں "(19)

"فرار" پرویز بلگرامی کا ناول ہے۔ 236 صفحات پر مشتمل یہ ناول علی میاں پبلی کیشنز سے چھاپا گیا ۔ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کے لکھاری 1962ء میں پیدا ہوئے ۔ناول کا مکانی دائرہ کار تیج گاؤں اور جیسور کا علاقہ ہے جو ہندوستان کی سرحد کے بہت قریب ہے۔ ناول کا موضوع حب الوطنی اور بے وطنی کا درد ہے۔ ناول مشرقی پاکستان سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہمارے وطن کا حصہ مخالفین کی سازش کے باعث ہم سے الگ ہو گیا۔ یہ ناول ایک پاکستانی جاسوس کی کہانی ہے جسے ہندوستان سے پاکستانی خفیہ ایجنسی تک خبریں پہنچانے کے لیے گونگے اور پاگل ہونے کا کردار ادا کرنا پڑا۔ جنگ کے دوران دشمنوں کی زد میں آگیا۔ وہاں سے کسی طرح اپنی جان بچالی۔ اور ایک ہندو خاندان کے ساتھ آکر رہنے لگا۔ فوج کی ڈیوٹی نبھاتے نبھاتے اس کی جیسور میں منتقلی کر دی گئی۔ دشمنوں کی سازشیں بار آور ہوئیں

اور پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ فوج کی بہادری اور قربانی کی عظیم مثالوں کو قلمبند کیا ہے۔ دنیا میں طرح طرح کے لوگ ہیں جن سے یہ دنیا چل رہی ہے، اگر پانچوں انگلیاں برابر ہو جائیں گی تو یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ فوج کے کردار کو بے داغ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"جنگ میں اصول کو اہمیت دی جاتی ہے کہ اگر پوزیشن کمزور پڑ رہی ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ ہم نے یہی کیا تھا۔ دنیا اسے ہماری شکست کہتی ہے تو کہتی رہے مگر اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ خیر ہم لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے تھے اگر یہ غلط ہے تو دنیا دکھادے کہ پورے مشرقی پاکستان میں کہیں سے بھی کسی بھی بارڈر سے بھارتی فوج اندر آئی ہو"[20]

فوج دن رات، بے سروسامانی کی حالت میں بارڈر پر لڑتی رہی اور مخالف فوج کی ہمت نہ تھی کہ وہ بارڈر کے راستے مشرقی پاکستان میں گھستی ہے۔ دشمنوں سے ہمدردی حاصل بھی ہو تو اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ وہ کسی وقت بھی آپ پر وار کر سکتے ہیں۔

"اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا۔ دراصل مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میں یہاں بھی زیادہ محفوظ نہیں ہوں کیوں کہ میں انسان ہوں، انسان جو ہمیشہ غیر محفوظ رہا ہے ۔ صحرا میں رہتا ہے تو پیاس مار دیتی ہے، جنگل میں جاتا ہے تو درندے پھاڑ کھاتے ہیں اور شہر میں رہتا ہے تو لوگ تیا پانچہ کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی تو کبھی کسی کے تعصب کا شکار ہونا پڑتا ہے کیونکہ ہر انسان کے اندر بھی ایک انسان پاؤں پسارے رہتا ہے۔ جو انسان نہیں ہوتا ،درندہ ہوتا ہے اور موقع ملتے ہی جھپٹ پڑتا ہے۔ یہ لوگ مجھ پر بھی جھپٹ سکتے ہیں کیوں کہ اس علاقے میں بھی انسان رہتے ہیں اور سب کے سب تعصب سے بھرے پڑے ہیں۔ میں مسلمان ہوں اور یہ سب ہندو، ایسے ہندو جو میرے وطن کی پامالی پر شاداں ہیں۔ اس کے ٹکڑے ہونے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے"۔[21]

مصنف نے ایک فوجی کی زندگی کے دلخراش واقعے کو بیان کیا ہے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے وقوع پذیر ہونے کے بعد کا وقت ہے۔ بٹوارے کے بعد راہِ فرار نہیں مل پاتی وہ ادھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے کئی گھر ٹوٹ گئے اور کئی گھروں کے چراغ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ کہانی کا کردار بھی ایک نو بیاہتا کردار ہے جو کچھ ہفتے پہلے اپنی شادی شدہ زندگی گزار کر آیا تھا۔ فوج کے جوان دن رات عوام کی خدمت اور حفاظت کے لیے مصروف ہوتے ہیں اور وہ اپنے گھر والوں کو بھی وقت نہیں دے پاتے۔ جنگ کے بعد کی ہر صعوبت اور مشکل سے گزر کر وہ واپس جب اپنے گاؤں جاتا ہے تو ایک اور ناقابل فراموش حقیقت اس کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ وہ جنگ کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی زندگی میں بھی ہار جاتا ہے:

"حسن شاہ کا ایک ہی تو بیٹا تھا منتظر علی شاہ اسی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔اس کا جواب سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ میں نے کانپتی آواز میں پوچھا "اس لڑکی کا نام صالحہ تو نہیں ہے؟"(22)

خالد فتح محمد کا ناول" خلیج "2008 ءمیں منظر عام پر آیا۔ جمہوری پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ ناول 180 صفحات پر مشتمل ہے۔ انتساب شاہد شیدائی کے نام کیا گیا ہے۔ ناول چار حصوں میں منقسم ہے۔ ناول کو ذیلی عنوانات کی بجائے نمبروں کی تقسیم سے نشان دہی کی گئی ہے۔ ناول کا آغاز ہوائی سفر کے خوبصورت مناظر سے ہوتا ہے۔ جنگ کا خدشہ ہے اور نوجوان فوجی افسروں کو عسکری تربیت کی غرض سے ڈھاکہ بھجوایا جاتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار لیفٹیننٹ افضل ایک صاف گو، نڈر اور بے باک کردار ہے۔ ثانوی کرداروں میں کیپٹن بشیر، کیپٹن شاہد، کیپٹن غفار، شہباز، یاسمین، میجر بلال وغیرہ شامل ہیں۔ ڈھاکہ پر عوامی لیگ کا قبضہ تھا۔ مشرقی پاکستانیوں نے اسلحے کی مدد سے مغربی پاکستانیوں کے خلاف محاذ کھڑا کر لیا۔ دوسری طرف پاکستان کے نظریے کی حفاظت کرنا بھی پاکستانی قوم کے ذمے تھا۔ پاکستان کے فوجی جوان ایک بہت بڑی ذمہ داری نبھا رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تدبیر، ہمت اور بہادری سے ایسے مخالف کو شکست دینا تھی جس کی معاونت تمام سازشی عناصر کر رہے تھے۔ دشمن کی تعداد، اہلیت اور زمینی حالات کی بے خبری کے علاوہ انھیں مقامی مدد بھی حاصل نہ تھی۔ دوست اور دشمن کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی مثال ناول میں یوں ملتی ہے:

"رنگ پور کے اسٹیشن پر تمام غیر بنگالیوں کو اکٹھا کیا گیا تاکہ انھیں حفاظتی مقامات کی طرف منتقل کیا جا سکے لیکن وہ بھی دشمن کی ایک مکروہ چال تھی وہ اس میں کامیاب ہوا اور تمام غیر بنگالیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا"(23)

نسلی اور علاقائی تعصب کی جنگ جو دو ملکوں میں جاری تھی اس میں عورتوں اور بچوں کو بھی بے رحمی اور سفاکی سے قتل کیا گیا۔ بنگالی مرد غیر بنگالی عورتوں کو نشانے پر رکھے ہوئے تھا اور غیر بنگالی مرد، بنگالی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کا عزم رکھتا تھا۔ یکسانیت میں اکیلے پن کا شکار ہونا ایک فطری امر ہے ۔ناول میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔

مرشد علی اور جمعدار جیسے کردار مکتی باہنی کے لیے مخبری کا کام کرتے تھے۔ برتری کا احساس اور زیادہ کی خواہش رکھتے تھے۔ لیفٹیننٹ افضل یاسمین سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس محبت کے پس منظر میں ہوس کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے جسے چند جذباتی باتوں سے دھندلا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مشرقی پاکستان میں حالات کو خراب کرنے میں کئی جذباتی رویے بھی کارفرما ہیں جس کی مثال کرنل بشیر کے کردار سے واضح ہے جو اپنی بیوی کی موت کے بعد

نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ناول میں مکتی باہنی کے ظلم اور بربریت کی روداد قلم بند کی گئی ہے۔شہباز کا کردار بھی اسی جذباتی اور نفسیاتی رویے کی ایک کڑی دکھایا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے المیے نے اُردو ناول پر گہرا اثر کیا ہے۔اس المیے سے جنم لینے والی کئی کہانیوں کو اردو ناول میں نہایت عمدہ انداز میں برتا گیا ہے۔خاندانوں کی ہجرت ہو یا آنگنوں کی تقسیم، دوستی کا پاس ہو یا دشمنی کی سازشیں، انفرادی اور اجتماعی سطح پر لاکھوں انسان اس المیے سے متاثر ہوئے ہیں۔یوں یہ المیہ برصغیر میں بسنے والے لوگوں کی صرف تاریخ کا اہم باب ہی نہیں بنا ہے بلکہ ان کی انفرای و اجتماعی نفسیات کا حصہ بن کر اردو ادب اور خصوصاًناول کی صنف میں جلوہ گر بھی ہوا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

ا۔ ضیاءالحسن، بالمشافہ گفت گو، بمقام شعبہ اردو، لاہور: اورینٹل کالج، 13 / اکتوبر 2018ء

2۔ احمد رئیس، جعفری، خطبات قائداعظم، لاہور: مقبول اکیڈمی، 2003ء، ص592

3۔ بنت الاسلام، ذرا نم ہو تو یہ مٹی، لاہور: ادارہ بتول، 1978 ء، ص9

4۔ قرۃالعین حیدر، آخر شب کے ہمسفر، انڈیا: علوی ایجوکیشنل بک ڈپو، 1979 ء، ص123

5۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، لاہور: فیروز سنز، 1991ء، ص234

6 ۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، ص 251

7۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، لاہور، قومی کتب خانہ 1984 ء، ص6

8۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، ص21

9۔ ایضاً، ص 217

10۔ طارق اسماعیل ساگر، وطن کی مٹی گواہ رہنا، لاہور: قومی کتب خانہ، 1986 ء، ص272

11 ۔ طارق اسماعیل ساگر، وطن کی مٹی گواہ رہنا، ص217

12۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1986 ء، ص5

13۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، ص32

14۔ ایضاً، ص35

15۔ عبدالصمد، دوگز زمین، لکھنو: نصرت پبلی کیشنز، 1988 ء، ص225

16۔ عبدالصمد، دوگز زمین، ص187

17۔ ایضاً، ص289

18۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، کراچی: مکتبہ اسلوب، 1988 ء، ص320

19۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2009ء، ص106
20۔ پرویز بلگرامی، فرار، لاہور: علی میاں پبلی کیشنز، 2009ء، ص87
21۔ پرویز بلگرامی، فرار، ص121
22۔ ایضاً، ص235
23۔ خالد فتح محمد، خلیج، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2008ء، ص35

References in Roman Script:

1. Zia-ul Hassan, Bilmashafa Mulaqat, Bamaqaam Department of Urdu, Lahore: Oriental College, 13 October 2018
2. Ahmad Raees Jafari, Khutbat-i Quaid-i Azam, Lahore: Maqbool Academy, 2003, P592
3. Bint-ul Islam, Zara Nam Ho tou Yeh Mitti, Lahore: Idara-i Batool, 1978, P9.
4. Qurat-ul Ain Haider, Aakhir-i Shab k Hamsafar, India: Alvi Educational Book Depot, 1979, P123
5. Altaf Fatima, Chalta Musafir, Lahore: Feroz Sons, 1991, P234.
6. Altaf Fatima, Chalta Musafir, P251
7. Tariq Mehmood, Allah Megh dey, Lahore: Qaumi Kutb Khana, 1984, P6.
8. Tariq Mehmood, Allah Megh dey, P21
9. As Above, P217
10. Tariq Ismail Sagar, Watan ki Mitti Gavah Rehna, Lahore: Qaumi Kutb Khana, 1986, P272
11. Tariq Ismail Sagar, Watan ki Mitti Gavah Rehna, P217.
12. Tariq Mehmood, Allah Megh dey, Lahore: Sang-i Meel Publications, 1976, P5
13. Tariq Mehmood, Allah Megh dey, P32.
14. As Above, P35
15. Abdul Samad, Dau Gaz Zameen, Lucknow: Nusrat Publications, 1988, P225
16. Abdul Samad, Dau Gaz Zameen, P187
17. As Above, P289
18. Raziya Faseeh Ahmad, Sadiyon ki Zanjeer, karachi: Maktaba-i Usloob, 1988, P320
19. Salma Awan, Tanha, Islamabad: Dost Publications, 2009, P106.
20. Parvez Bilgrami, Faraar, Lahore: Ali Miyan Publications, 2009, P87.
21. Parvez Bilgrami, Faraar, P121
22. As Above, P235
23. Khalid Fateh Muhammad, Khaleej, Lahore: Sang-i Meel Publications, 2008, P35